

بے آواز گلی کوچوں میں

احمد سراز



بے آواز گلی کوچوں میں

احمد سدراز

BE AWAZ GALI KUCHON MEIN

(Urdu Poetry)

by

AHMAD FARAZ

Year of Edition 2002

ISBN-81-87666-22-6

Price. Rs. 80/=

نام کتاب..... بے آواز گلی کوچوں میں
مصنف..... احمد فراز
سن اشاعت..... ۲۰۰۲ء
قیمت..... ۸۰ روپے
مطبع..... کاک پرنٹرس، دہلی

Published by:

Kitabi Duniya

1955, Turkman Gate, Delhi-6 (INDIA)

E-mail kitabiduniya@rediffmail.com

ڈاکٹر عطیہ کے نام

شہرِ غزل کی گلیوں میں دلگیر ترے
تجھ سے تیری باتیں کرتے جاتے ہیں

ترتیب

- 9 ناموجود
- 10 دوسری ہجرت
- 11 باتاں دل کا شہر، نگرِ خموس کا ہے
- 13 شہر کسی کے جہ میں کہنا حرف وصال کسی سے
- 14 سویا تھا یا جاگ رہا تھا ہجر کی رات
- 16 یہ میں بھی کیا ہوں اسے بھول اسی کا رہا
- 17 ہم سے کہیں سب دوست ہمارے مت لکھو
- 19 فضا ہے ابرِ ٹانہیں بے ثمر ہیں
- 21 بن باس
- 25 شہر کتاب اچھڑ گیا، لفظ پر ہنہ سر جوئے
- 26 کب ہم نے کہا تھا ہمیں دستار و قباد
- 27 فیض کے فراق میں
- 29 سرود صنوبر شہر کے مرتے جاتے ہیں
- 31 کب تک کارِ دل کو تو آنکھوں کو غم کریں

قید تنہائی کی چند عبارتیں

- 34 پہلی آواز
- 35 آشیاں گم کردہ
- 36 پچھلا پہر
- 38 پیاد جاناں
- 39 غزلاں تم تو واقف ہو
- 40 پاس کیا تھا
- 42 چاند کتاب ہے نہ آتی ہے صبا زنداں کے پاس
- 43 اے شہر میں تیرا نگہ گر ہوں
- 45 ندیم آنکھیں، ندیم چہرہ
- 51 ہر کوئی طرہ نچاک، مہن کر نکلا
- 53 قاصد کہو تر
- 55 غفریت
- 58 اب لوگ جو دیکھیں گے تو خواب اور طرح کے
- 60 پہچانہ کہتے ہو بہت صاحبو دستار کے بیچ
- 61 اپنی ہی آواز کو بے شک کان میں رکھنا

- 63 دو ظلمتیں ہیں کہ شاید قبول شب بھی نہ ہوں
64 نہجائی و منع بسمل انجہیک
65 میرے خضر کے موسیٰ
70 مکین خوش تھے کہ جب بند تھے مکانوں میں
71 عشق کا شہر بھی دیکھو کیا نیرنگ بھرا ہے
73 اب کے ہم پر کیسا سال پڑا لوگو
74 جانے کس زعم میں مقتل کو سجائے تم ہو
76 اک بوند تھی ابو کی سردار تو مری

ایک بد نما صبح کے بارے میں کچھ نظمیں

- 79 سارا شہر ہلکتا ہے
81 بلا د
83 چلو اس شہر کا ماتم کریں
86 حرف کی شہادت
88 جب یار نے رخت سفر باندھا
89 لباس دار نے منصب نیا دیا ہے اسے
91 رتجگ ہوں کہ بھر پور نیندیں مسلسل اسے دیکھنا

93	جو کچھ کہیں تو دریدہ دہن کہا جائے
94	گرفتہ دل فندیب، گھائل گلاب دیکھے
96	دشمن کا قصیدہ
98	وفا کے بھیس میں کوئی رقیب شہر بھی ہے
100	ہواؤں کی بشارت
102	مت قتل کرو آوازوں کو
104	عجب شہر تھا، اور عجب لوگ تھے
106	یہ کس نذاب سے فائز مرا قبیلہ ہے
107	جنہیں زعم کمانداری بہت ہے
108	شہر آشوب
113	میں سرور

ناموجود

اے خدا تری مخلوق
جبر کے اندھیروں میں
دفن ہو چپکلی کب کی
تیرے آسمانوں سے
نامزد فرشتوں کی
اب سفارتیں کیسی

بے وجود بستی میں
لوگ اب نہیں رہتے
سکیاں سکتی ہیں
سائے سرسراتے ہیں
شورجوں، ستاروں کی
اب سفارتیں کیسی

دوسری ہجرت

پھر مرے مکتوب سے پیغبر
ہجرت کر کے چلا گیا ہے
اور اب پھر سے
کعبہ کے زم خور وہ نبوت
اصنامِ طلائی
اپنی اپنی مسند پر آ بیٹھے ہیں
سیچ کا لہو
اُن کے قدموں میں
غنائی قالین کی صورت بچھا ہوا ہے
کھوابی خیروں کے اندر
بزمِ مریضیاں پھر بھتی ہے
کذب و ریا کی آفت بھتی ہے



جاناں دل کا شہسہ نگہ افسوس کا ہے
تیرا میرا سارا سفر افسوس کا ہے

کس چاہت سے زہرِ تمنا مانگا تھا
اور اب ہاتھوں میں ساغرِ افسوس کا ہے

اک دھیلز پہ جا کر دل خوش ہوتا تھا
اب تو شہسہ میں ہر اک درِ افسوس کا ہے

مسم نے عشقِ گناہ سے بڑر جانا تھا
اور دل پر پہلا پتھر افسوس کا ہے

بے آواز مگلی کوچوں میں

دیکھو اس چاہت کے پیڑ کی شاخوں پر
نہول اُداسی کا ہے ، شر افسوس کا ہے

کوئی پچھتاوا سا پچھتاوا ہے فِراز
دُکھ کا نہیں افسوس مگر افسوس کا ہے



شعر کسی کے ہجر میں کہنا صرفِ دھال کسی سے
ہم بھی کیا ہیں دھیسان کسی کا اور سوال کسی سے

ساری متاع ہستی اپنی خواب و خیال تو ہیں
وہ بھی خواب کسی سے مانگے اور خیال کسی سے

ایسے سادہ دل لوگوں کی چارہ گری کیسے ہو
درد کا قہر اور کوئی ہو کہہ نہ سکا حال کسی سے

دیکھو اک صورت نے دل میں کیسی جوت جگائ
کیا سجا سجا لگتا ہے شہرِ طلال کسی سے

تم کو زعم فرازا اگر ہے تم بھی جتن کر دیکھو
آج تک تو ٹوٹ نہ پایا درد کا جال کسی سے



سویا تھا یا جاگ رہا تھا جس کی رات
آنکھوں پر محسوس کیئے ہیں اس کے ہاتھ

اُسکو دیکھنا دیکھتے رہنا کافی مت
لوٹ آیا ہوں دل میں لے کر دل کی بات

کیسے اب میں اوروں کو بے درد کہوں
میں بھی تھوڑی دُور گیا تھا اُس کے ساتھ

بُہت زمانوں بعد کوئی واپس آیا
لے کر ٹھہری بصری یادوں کی سوغات

بے آواز گلی کوچوں میں

موجِ تنگِ دنیا بھر کے لوگوں سے
لیکن آنکھ میں دُستِ دل میں اسکی بات

شہرِ محبت کب سے خالی خالی سے
ہم بھی فرازِ یہاں ہیں شاید رات کی رات



یہ نہیں بھی کیا ہوں اُسے بھول کر اُسی کا رہا
 کہ جس کے ساتھ نہ تھا، مسافر اُسی کا رہا

وہ بت کر دشمن دیں تھا بقول نامع کے
 سوالِ مجدد جب آیا تر در اُسی کا رہا

ہزار چارہ کروں سنے ہزار باتیں کہیں
 کہا جو دل نے سخنِ مستبر اُسی کا رہا

بہت سی خواہشیں سو بارشوں میں بیگی ہیں
 نہیں کس طرح سے کہوں غمِ بھر اُسی کا رہا

کہنے حرف کی توقیر جانتا تھا فراز
 کہ بے کف دستِ تار پہ نہ اُسی کا رہا



ہم سے کہیں کچھ دوست ہمارے مُت بگتو
جان اگر پیاری ہے پیاسے مُت بگتو

حاکم کی تلوار مقدس ہوتی ہے
حاکم کی تلوار کے پاسے مُت بگتو

کہتے ہیں یہ دارورسن کا موسم ہے
جو بھی جس کی گردن مارے مُت بگتو

لوگ ابہام کو بھی افساد سمجھتے ہیں
جو دل پر وجہ ان امانے مُت بگتو

بے آواز گلی کوچوں میں

وہ لکھنؤ ہیں جو بھی امیسر شہر ہے
جو کہتے ہیں درد کے مارے مُتِ لکھنؤ

خود مُنصفِ پابستہ ہیں لبِ بستہ ہیں
کون کہاں اب عرض گزارے، مُتِ لکھنؤ

کچھ اعزازِ رسیدہ ہم سے کہتے ہیں
اپنی بیاض میں نامِ ہمارے مُتِ لکھنؤ

دل کہتا ہے کھل کر سہی بات کہو
اور لفظوں کے بیچ تارے مُتِ لکھنؤ



فضا بے ابر شاخیں بے ثمر ہیں
پرندوں سے سحر محروم تر ہیں

کوئی موسم قرینے کا نہ آیا
جواؤں کے سخن نا معنبر ہیں

تری قربت کے لمحے پھول جیسے
مگر پھولوں کی مسمریں مختصر ہیں

بہت سے زحمت تیرے نام کے تھے
اسی باعث بہت سے چہارہ گر ہیں

بے آواز گلی کوچوں میں

پٹے ہیں شہرتوں میں فاصلے وہ
کہ جو نزدیک تر تھے دُور تر ہیں

شبِ افسوس کے بجھتے چہرے افسو
ذرا شہر کہ ہم بھی رات بھر ہیں

نہ از اپنا مستدرنگاری
ہمیں اس عہد کے آئینہ گر ہیں

بن باس

میرے شہر کے سارے رستے بند ہیں لوگو
میں اس شہر کا نغمہ گر
جو دو ایک موسمِ غریب کے ڈکھ جھیل کے آیا
تا کہ اپنے گھر کی دیواروں سے
اپنی تسلی ہوئی اور ترسی ہوئی
آنکھیں سہلاؤں
اپنے دروازوں کے اترتے روغن کو
اپنے اشکوں سے صیقل کر لوں
اپنے چمن کے جلے ہوئے پودوں
اور گرد آلود درختوں کی
مردہ شاخوں پر بین کروں
ہر بھڑستون کو اتنا ٹوٹ کے چٹموں
میرے لبوں کے خون سے

ان کے نقش و نگار سبھی جی اٹھیں
گلی کے لوگوں کو اتنا دیکھوں

اتنا دیکھوں

میری آنکھیں

برسوں کی ترسی ہوئی آنکھیں

چہروں کے آئین بن جائیں

پھر میں اپنا ساز اٹھاؤں

آنسوؤں اور مسکानوں سے جھل جھل

نغمیں غزلیں گیت سناؤں

اپنے پیاروں

درد کے ماروں کا درماں بن جاؤں

لیکن میرے شہر کے سارے رستوں پر

اب بارش ہے لہے کے کاشوں کی

شہ دروازے پر کچھ پہرہ دار کھڑے ہیں

جو مجھ سے امد مجھ جیسے دل والوں کی

پہچان سے ماری

میرے ساز سے

سنگینوں سے بات کریں
میں اُن سے کہتا ہوں
دیکھو

میں اس شہر کا نغمہ گر ہوں
برسوں بعد کڑی ماہوں کی
ساری اذیت جھیل کے اب واپس آیا ہوں
اس مٹی کی خاطر
جس کی خوشبو میں
دُنیا بھر کی دوشیزاؤں کے جسموں کی مہکوں سے
اور سارے جہاں کے

بسمی گلابوں سے

بڑھ کر ہے

مجھ کو شہر میں

میرے شہر میں جانے دو

لیکن شے ہوئے تیزوں نے

میرے جسم کو یوں برمایا

میرے ساز کو یوں ریزایا

میرا ہمکنا خون اور میرے سسکتے نغمے
شہ دروازے کی دھیلز سے

رستے رستے

شہر کے اندر جا پہنچے ہیں

اور میں اپنے جسم کا طبع

ساز کا لاش

اپنے شہر کے شہ دروازے

کی دھیلز پر پھوڑ کے

پھر انجانے شہروں کی شہراہوں پر

بجھوڑ سفر ہوں

جن کوچ کر گھر آیا تھا

جن کوچ کر گھر آیا تھا



شہرِ کتاب اُبر دگیا، حرفِ برص نہ سر ہوئے
نغمہ سے سُرمہ در گلو، شعرِ دامن بدر ہوئے

موسمِ درد کے صغیر جو بھی ندیم تھے، سوتے
اب تو کبھی فریفتہ دل نہ و دام پر ہوئے

جامِ وسبُو کی آبرُو اہلِ ہوس کے ہاتھ ہے
جب سے فقیہہ و محتسب شہر میں معتبر ہوئے

سرد جواں کی سوست پر دیں گی قمریاں نہایت
یوں تو بغیضِ باغباں قتل کسی شجر ہوئے

درِ خُردِ حرفِ یاد تھے جن کے نے ہمیں فراز
آج وہی ستمِ غریفِ غیر کے نامہ بر ہوئے



کب ہم نے کہا تھا ہمیں دستار و قبا دو
ہم لوگ نوا گر ہیں ہمیں اذنِ نوا دو

ہم آٹنے لائے ہیں سرِ کوئے رقیباں
اے شکِ فروشِ یہی الزام لگا دو

لگتا ہے کہ ملہ سا لگا ہے سرِ قتل
اے دلِ زدگاں بازوئے قاتل کو دُعا دو

ہے بادہ گساروں کو تو میخانے سے نسبت
ثم مسندِ ساقی پر کسی کو بھی بٹھا دو

میں شب کا بھی مجرم تھا سحر کا بھی گنہگار
لوگو مجھے اس شہر کے آداب سکھا دو

فیض کے فراق میں

اے مائی کے لال تجھے سب یاد کریں
یاد کریں بھگی آنکھوں
اور دُکھتے دلوں سے یاد کریں
ہر سال

اے مائی کے لال تجھے سب یاد کریں
تیری کریتا میری تیری دھرتی کی سچائی
تیرے بول ہیں سارے گونجے شہروں کی گویائی
تیرے گیت ہیں امن کی نئے اور آشتی کی شہنائی
آئین اور چو پال تجھے سب یاد کریں
یاد کریں بھگی آنکھوں
اور دُکھتے دلوں سے یاد کریں
ہر سال

اے مائی کے لال

بے آواز گلی کوچوں میں

کوی تجھے دُنیا اپنائے لیکن اپنا شہر
اپنا شہر کہ حدِ نظر تک جیسے لہڑ کی نہر
یا منصور و سیح کی سولی یا سقراط کا زہر
ہم آشفۃ حال تجھے سب یاد کریں
یاد کریں ہر سال

اے مائی کے لال

بہر کی رست گئے روز رہے گی

اور فقط کچھ روز

وصل کی ساعت آپہنچے گی

اور فقط کچھ روز

راہ کی ہر دیوار گرے گی

اور فقط کچھ روز

گلے میں باہنیں ڈال تجھے سب یاد کریں

اے مائی کے لال

تجھے سب یاد کریں

تجھے سب یاد کریں

(ستروں ساگر پر)



سرد و سنو بر شہر کے مرتے جاتے ہیں
سارے پرندے ہجرت کرتے جاتے ہیں

پھر سے ٹوٹ کے رونے کی رت آئی ہے
پھر سے دلوں کے زخم نکھرتے جاتے ہیں

جھوٹی سچی تعبیروں کی خواہش میں
کیسے کیسے خواب بکھرتے جاتے ہیں

کیسے کیسے یاروں کا بہرہ و سپ گھلا
کیسے کیسے غول اترتے جاتے ہیں

ان حالوں کب اپنے آپ کو دیکھا تھا
کہنے کو دن رات گزرتے جلتے ہیں

رہگیروں کی خاموشی کو غور سے سُن
یوں ہے جیسے ماتم کرتے جاتے ہیں

ماں مٹی سے خوں مانگا تھا اور بیٹے
پانی سے تالاب کو بھرتے جاتے ہیں

کبھی کبھی کوئی ایسا مُسافر آتا ہے
رہنے اپنے آپ سہرتے جاتے ہیں

کوئی نیا احسان کہ مہمِ دیرینہ
جتنے پرانے زخم تھے بھرتے جاتے ہیں

شہرِ غزل کی گلیوں میں دِلیکیر ترے
مجھ سے تیری باتیں کرتے جاتے ہیں

بے آواز گلی کوچوں میں

کب تک فکارِ دل کو تو آنکھوں کو نم کریں
آؤ حدیثِ قاتل و بھل رستم کریں

رند اٹھاؤ حجام کہ بس ہو چکی بہت
تا چند پاسِ بیعتِ شیخِ حرم کریں

آنکھوں کے طاقوں میں جلا کر چراغِ درد
خونِ جگر کو پیرے سپردِ سلم کریں

تا چند جشنِ مرگِ رفیقاںِ مس کے ہم
اسبابِ دلنوازیِ قاتلِ بہم کریں

ہے آواز گلی کوچوں میں دلیق اویس و چادرِ زہرا کدھر گئی
دزدانِ نیم شب سے تقاضا تو جسم کریں

زخموں سے چُر جسم بنائیں نشانِ راہ
جو ہاتھ کٹ چکے ہیں اُنہیں کو غلم کریں

بے آواز گلی کوچوں میں

قیدِ تنہائی چند عبارتیں

مانسریپ، ممبئی

پہلی آواز

اتنا سنا کہ جیسے ہو سکوتِ صحرا
ایسی ناریکی کہ آنکھوں نے دُہائی دی ہے

جانے زنداں سے اُدھر کونسے منظر ہونگے
مجھ کو دیوار ہی دیوار دیکھائی دی ہے

دُور اک فاختہ بولی ہے بہت دُور کہیں
پہلی آواز محبت کی سنائی دی ہے

اشیاں گم کردہ

عجب منظر سوادِ شام کے آنکھوں میں پھرتے ہیں
ہوا سُوج کی مثل کو جھلاتی ہے بجھاتی ہے

انق پر کتنی تصویریں ابھرتی ہیں بکھرتی ہیں
شفق میں آشنا چہروں کی رنگت پھیل جاتی ہے

تو دامنِ نظر میں بے محابا پھول کھلتے ہیں
تو جیسے جوئیں بارِ بار یاں گسنگاتی ہے

وہ ہمدِ مجھ کو حیران و پریشان ڈھونڈتے ہوں گے
کہ جن کی مہرباں آنکھوں میں شبِ بنم جھلاتی ہے

قص میں روزِ دین دیوارِ وزِ حسم در نہیں لیکن
زائے طائرانِ اشیاں گم کردہ آتی ہے

پچھلا پہر

نہ کہیں شہر مہرباں کی ہوا
نہ کوئی یارِ ہمدرد و دمساز

نہ سرِ بامِ زلفِ آوارہ
نہ سرِ راہِ چشمِ فتنہ طراز

نہ کہیں کونے چاکِ داماناں
نہ کہیں رُوسے دوستانِ فراز

نہ کوئی بیتِ بیدل و غائب
نہ کوئی شعرِ حافظِ شیراز

نہ کوئی شمع کشتہ شب ہے
نہ کوئی عندلیب سینہ گداز

خلوتِ عنم نہ بزمِ رسوائی
نہ سوالِ طلب نہ عرضِ نیاز

چار سواکِ فیلِ بے درہمے
چار جانبِ حصارِ بے انداز

نیزد کے طائرانِ بے پروا
شارخِ مژگاں سے کر گئے پرواز

ایسی دیرانیوں سے گھبرا کر
جب اٹھاتا ہوں تیری یاد کا ساز

تڑپتی سے سسلی سامے
پہرہ داروں کی بدشا آواز

بیادِ جاناں

دلِ قفس میں بھی غزلِ نواں ہے بیادِ جاناں
غمِ جاں بھی غمِ جاناں سب سے بیادِ جاناں

کب رگِ دہے میں نہ تھا درد کا قاتلِ نشتر
آج پیوستِ رگِ جاں ہے بیادِ جاناں

یوں صبا آتی ہے گلگشت کو نیسے زنداں
کوچہ چاکِ گریباں ہے بیادِ جاناں

غزالاں تم تو واقف ہو

غزالاں تم تو واقف ہو سو ہو مجنوں پہ جو گزری
جو نالہ محلِ لیلے میں تھا جسم بھی سبکتے ہیں

بوسِ والوں کو کیا کیا ناز ہے اپنے قرینوں پر
مگر رسمِ ورہِ شہر و منام بھی سبکتے ہیں

یونہی آئے نہیں ہیں کوچہ چاکِ گریباں میں
مزاچِ دلِ محبت کی ادامم بھی سبکتے ہیں

تبہارِ آنے سے پہلے پیرِ بن میں آگ لگتی ہے
لسانِ لالہ آتشِ قیسا بم بھی سبکتے ہیں

پاس کیا تھا

پاس کیا ممتا کہ لڑتی دنیسا
مسم تو کل بھی ستے بے سرو ساماں

آج دیوار پکچ گئی سنے اگر
شہر کل بھی تھا صُورستِ زنداں

کب ینر ہوا ممتا روزِ وصال
کب ممشد رنہ تھی شبِ ہجرال

اک متاعِ سخن تھی پاس اپنے
ایک سازِ وفا تھا دولتِ جاں

بے آواز گلی کوچوں میں

اب بھی خوش بخت ہیں ترسے وحشی
اب بھی خوش وقت ہیں ترسے ناداں

دردِ ستائم ہے یادِ باقی سے
اک تیری دیدِ چمن گنی جاناں



چاند نکلتا ہے نہ آتی ہے صبا زنداں کے پاس
کون لے جائے مرے نامے مرے جاناں کے پاس

اب بجز ترکِ دمن کوئی خیال آتا نہیں
اب کوئی حیلہ نہیں شاید دلِ ناداں کے پاس

چند یادیں زورِ گرہیں خمیہء دل کے قریب
چند تصویریں مجلسِ صمصامِ مرگاں کے پاس

شہرِ دلے سب امیرِ شہر کی مجلس میں ہیں
کون آنے کا غریب شہرِ تاپڑساں کے پاس

لوک کیڑوں کرتے ہیں اب چارہ گری کے تذکرے
اب بجز حرفِ تسلی کیا ہے غمِ خواراں کے پاس

اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہوں

گیتوں سے تجھے بُھانے والا
خوابوں سے تجھے بجانے والا
میں تیری اداس ساعیوں میں
رُسنے والا، زلزلے والا
میں تیری خوشی کی محسوسوں میں
نغموں کے پرلغ لانے والا

مہرناہ میں تیرا ہمسفر ہوں
اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہوں

اب ہاتھوں میں مرے جھکڑی ہے
 اب پاؤں میں میرے بیڑیاں ہیں
 اب دست صبا ہے دست قاتل
 اب ابر کرم میں بھلیاں ہیں
 اب جس دوام میسری قسمت
 یا میرا نصیب پھانسیاں ہیں

میں اپنی خطا سے بے خبر ہوں
 اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہوں

پھر بھی نہیں جی کو رنج کوئی
 اور آنکھوں میں اشکِ خوں نہیں ہے
 پھر بھی نہیں دردِ دل گزشتہ
 میں نالہ بلب ہوں یوں نہیں ہے
 دیکھوں تو بیاضِ شعرِ میری
 اک حرف بھی سسزنگوں نہیں ہے

زنداں میں ہوں کہ اپنے گھر ہوں
 اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہوں

ندیم آنکھیں ندیم چہرہ

ندیم چُپ تھا
مگر سدا کی شفیق آنکھوں پر
ڈکھ کی کاٹی جی ہوئی تھی
سدا کے اُس مہربان چہرے کا زحمت
جو کب کا بھر چکا تھا
وہ پھر ہر اہو کے کچ لب سے دل و جگر تک پہنچ چکا تھا
ندیم چُپ تھا
بُٹے تو ایسا لگا کہ جیسے
کبھی نے اُس کے نحیف شانوں سے
اُس کے زندہ وجہ سر کو ہٹا کے
زُودنی کا ساختہ چہرہ سفالیں
لگا دیا ہے۔

یہ کرب ضبطِ الم کی مدد تھی
 بہت سے اجباب جمع تھے
 جب

عدالتِ عالیہ کے ایوان سے
 میں حراست میں
 باہر آیا

ادھر ادھر لوگ حال احوال پوچھنے کے لئے
 کھڑے تھے

تو کثرتِ کامراں کی آنکھوں میں سسکیاں
 اور گھٹے میں آنسو ہلکے گئے تھے

یہ وہ گھڑی تھی

کہ میرے اندر کے حوصلوں کی

بھی چٹانیں ترخ رہی تھیں

وہ زلزلہ سادجو میں تھا

کہ میری بنیاد بل رہی تھی

گناہ میرے قلم کا سپح تھا

اور اسکی پادشہ میرے یاروں کو

میرے پیاروں کو مل رہی تھی
 یہ ساعتِ جانستہاں کڑی تھی
 اور اس سے پہلے کہ سچ کا پندار
 واہموں سے شکست کھاتا
 ندیم کی مہربان آنکھیں
 ندیم کے دلتوازل لب مجھ سے کہہ رہے تھے
 واز ہم تم تو وہ ہیں
 جن کے نصیب میں زندگی کی ساری اذیتیں ہیں
 کہ جس مسافت پہ ہم چلے ہیں
 وہ عرصہ حق کی مجاہدت ہے
 ہمیں نہ عرصہ حشم نہ مال و منال کی آرزو رہی ہے
 نہ ہم کو طبل و مسلم نہ جاہ و جلال کی جستجو رہی ہے
 بس اک قلم ہے کہ جس کی ناموس
 ہم فقیروں کا گلِ اثاثہ سے آبرو ہے
 بس ایک سچ ہے
 کہ جسکی فرست کی آنکھیں سے
 برسے بدن میں برسے بدن میں

سرے قلم میں ترے قلم میں
 ڈبی لہو ہے
 کہ جس سے عرفان کی نمو ہے
 کہ جس سے انساں کی آبرو ہے
 ابھی سے تم ڈولنے لگے ہو
 ابھی سے نگو کے مقابلے میں صوفیوں تو نے لگے ہو
 مجھے بھی دیکھو
 کہ جس کے پیرا ہنِ دل و جاں پہ ساٹھ
 پیوند لگ چکے ہیں
 تمام پیوند زندگی کی دو بعتیں ہیں
 مگر مجھے مضجیل بھی دیکھا !؟
 کبھی مجھے منقیل بھی دیکھا !؟
 میں اب بھی دشتِ وفا میں گرم سفر ہوں گرم سفر ہوں
 کہ میں سمجھتا ہوں
 یہ وہ صحرائے درد ہے جس میں
 تشنگی ہے، گر سبکی ہے، بر سبکی ہے
 ہاں ملامت کے ننگ — طعنوں کے تیر

شرمندگی کے خنجر برس سہے ہیں
 یہاں تو ہر راہرو کی گردن میں طوق پاؤں میں بٹریاں ہیں
 یہاں تو زنداں کی ظلمتیں اور قتل گاہوں کی لالیاں ہیں
 مگر کبھی میں رُکا نہیں ہوں، مگر کبھی میں جھکا نہیں ہوں
 یہی تو دشتِ وفاس ہے جس میں
 تمہارے جسموں ہمارے جسموں
 کے ہر طرف استخزاں پڑے ہیں
 یہی تو وہ رستے ہیں جن میں
 صداقتوں کے امیں لڑے ہیں
 فقط ہمیں تو نہیں اکیلے
 یہاں بہت سے غم گڑے ہیں
 انہیں کے اشارے ہی جانبر صداقتیں ہیں
 انہیں کے افکار سے ہی
 ہم اہلِ دل کی باہم رفاقتیں ہیں
 تمہارے بازو ابھی تو ناہیں
 جسم میں غم کھولتا ہے

قلم سے عہد وفا کیا ہے
قلم تو پھر سچ ہی بولتا ہے
اشاد آتھیں کہ سچ امر ہے
قلم کا وجدان معتبر ہے

نیں کج غذاں میں آچکا ہوں
مگر ابھی تک
مری نگاہوں کے سامنے ہیں
ندیم آنکھیں ندیم چہرہ



ہر کوئی طرہ پہچاں پہن کر نکلا
ایک میں پیرہن خاک پہن کر نکلا

اودھ پر سب نے یہ دیکھا کہ اسی قاتل سے
میرا قاتل میری پوشاک پہن کر نکلا

ایک بندہ تھا کہ اٹھ سے تھانڈی ساری
اک ستارہ تھا کہ افلاک پہن کر نکلا

ایسی نفرت تھی کہ اس شہر کو جب آگ لگی
ہر بگولہ خس و خاشاک پہن کر نکلا

بے آواز گلی کوچوں میں

ترکش و دام جھٹ لے کے چلا ہے میتا
جو بھی غمخیز ہے فتراک پہن کر نکلا

اُس کے قامت سے اُسے جان گئے لوگ فراز
جو لباده بھی وہ چالاک پہن کر نکلا

قاصدِ کبوتر

یہ لہو
جس سے برے
شہروں کے سارے رستے
مگنوں ہیں
اور ہر پیرہن کا رنگ عتابی ہے
کل کے موسموں
اور آنے والے
شورجوں
کا زمزمہ گرہے۔

چلو تم نے تو
کالی سرخیاں
مقراض کر ڈالیں
سخن پنچیر کر ڈالے
قلم زنجیر کر ڈالے
مگر اب ان ہواؤں کو بھی روکو
جو تمہارے مقتلوں کی لالیاں
اور تازہ خوں کی خوشبوئیں
اور اُن کی آوازیں لے
گلیوں سے

بازاروں سے
شہراہوں سے جو کر
ہر طرف
قریب بہ قریب
پھیلی جاتی ہیں
نہوانو

ہوائیں نامہ بردہتی ہیں
جب قاصد کبوتر قید ہوتے ہیں۔

حضرت

خوفزدہ مائیں
بچوں کو سینوں سے پٹکے
تھر تھر کانپ رہی ہیں

بستی واسے کہتے ہیں
برسوں سے
اس قریہ میں
اک آدم خور حضرت ہے
جس کے بہت سے چہرے ہیں
اور جس گھر میں بھی
کسی صدا کی شمع جلے

یا کسی دُعا کا پھول کھلے
وہ صبح سے پہلے
سارے گھر کو کھا جاتا ہے

کتنی بار کئی

دل والے
اپنے دکھی سینوں میں غم کے جگر جگر اٹھکاتے
اور زخمی آنکھوں میں
جلجلیک جلجلیک تارے لے کر

اس حضرت کی کھوج میں نکلے

لیکن اگلی شام
اس ٹیڑھی تر بھی چمکند ٹی پر
جو کالے سانپوں

اور پیلے کانٹوں والے

جھل کر جاتی ہے

اُن کے سر

انکے بازو

اُن کی آنکھیں
لہو لہان
اور الگ الگ اور ٹکڑے ٹکڑے ملی ہیں
اس منظر کی دیدے اب تک
بستی والوں کے
مُنہ پر
اور آنکھوں پر
خود اُنکے اپنے ہاتھ دھرے ہیں



اب لوگ جو دیکھیں گے تو خواب اور طرح کے
اس شہر پہ اتریں گے عذاب اور طرح کے

اب کے تو نہ چہرے ہیں نہ آنکھیں ہیں نہ لب ہیں
اس عہد نے پہنے ہیں نقاب اور طرح کے

اب کوچہ و تال سے بلاوا نہیں آتا
قاصد ہیں کہ لاتے ہیں جواب اور طرح کے

سوتیر تراژڈی ہیں رگ جاں میں تو پھر کیا
یاروں کی نظر میں ہیں حساب اور طرح کے

بے آواز مکی کوچوں میں

اس درد کے مرسمنے عجب آگ لگائی
جسموں میں دہکتے ہیں مَکْلاَب اور طرَح کے

واسطے سے فراز اپنی بنی ہے نہ بنے گی
ہم اور طرَح کے ہیں جناب اور طرَح کے



بیچ دکتے ہو نہایت صابو دستار کے بیچ
ہم نے سرگرتے ہوئے دیکھے ہیں بازار کے بیچ

باغبانوں کو عجب رنج سے تکتے ہیں گلاب
گل فروش آج نہایت جمع ہیں گلزار کے بیچ

قاتل اس شہر کا جب بانٹ رہا تھا منصب
ایک درویش بھی دیکھا اُسی دربار کے بیچ

کچ اداؤں کی عنایت ہے کہ ہم سے عشاق
کبھی دیوار کے چہچہے کبھی دیوار کے بیچ

تم ہونا خوش تو یہاں کون ہے خوش پھر بھی ذرا
لوگ رہتے ہیں اسی شہر بدل آزار کے بیچ



اپنی ہی آواز کو بے شک کان میں رکھنا
لیکن شہر کی خاموشی بھی دھیان میں رکھنا

میرے جھوٹ کو کھولو بھی اور تولو بھی تم
لیکن اپنے سچ کو بھی میزان میں رکھنا

کل تاریخ یقیناً خُذ کو دھرا نے گی
آج کے اک اک منظر کو پہچان میں رکھنا

بزم میں یاروں کی شمشیر لہڑیوں میں ترسے
رزم میں سیکن تلواروں کو میان میں رکھنا

آج تو بسے دل ترکِ تعلق پر تم خوش ہو
گل کے پھتوسے کو بھی اسکان میں رکھنا

اس دریا سے آگے ایک سمندر بھی ہے
اور وہ بے ساحل ہے یہ بھی دھیان میں رکھنا

اس موسم میں ٹھکانوں کی رسم کہاں ہے
لوگو اب پھولوں کو آستان میں رکھنا



وہ غلتیں ہیں کہ شاید قبولِ شب بھی نہ ہوں
مگر حصارِ فلک میں شگاف اب بھی نہ ہوں

تمام شہرِ شائستگی کا زہر پیئے
نہ جانے کیا ہو جو دو چار بے ادب بھی نہ ہوں

وہ ساتیں ہیں عنایاتِ چشم و لب تو گئیں
وہ چاہتے ہیں حکایاتِ چشم و لب بھی نہ ہوں

ہر اک پہ وا نہ کرو شہرِ دل کا دروازہ
کہ آنے والوں میں دزدانِ نیم شب بھی نہ ہوں

مجھے تو ڈر ہے کہ شیخِ مرہ کے ہاتھوں سے
کہیں مری طرح زسوارِ رسول و رب بھی نہ ہوں



نبھائی وضعِ پہل انتہا تک
نہ مانگتا تلوں سے خوبہا تک

نہ جاسنے کیا بُرا زندانیوں کو
کہ بے آواز سے زنجیرِ پا تک

اڑا کرے گئیں ان موسموں میں
ہوائیں بے نواؤں کی روتا تک

وفا کے نام پر کچھ شعبہ گز
چُرا لیتے ہیں ہاتھوں کی جتا تک

فساد از آنکھیں گنوائیں غمِ کھوئی
کہا تھا کب سے اُس کا راستہ تک

میرے عصر کے موسیٰ

مالک

میں لفظوں کا گڈ ریا

حرفوں کے بڑ غالے

میری دنیا ہے

اس دنیا اور اسکے دکھوں کے

بھونچالوں سے

جب بھی مجھے پل دوپل ملے

اور بچے

سارے افلاک

اور ساری زمیںوں

کے سارے بسنے والوں کے

سارے جھوٹ اور سارے پرچ کے

جنجالوں سے ٹہکتا ہستی

ہم آپس میں باتیں کرتے

سیدھی پتھی پیاری باتیں
 جبر اور مکر سے عاری باتیں
 توشبہنم تھا تو موتی تھا تو خوشبو تھا
 میں پتا تھا میں پتھر تھا میں آنسو تھا
 لیکن میل رہا دونوں کا
 دونوں ہی نے اکثر
 سنا کہا دونوں کا
 مالک

میں نے اکثر سوچا
 تو جس کو
 دین کا آرام
 نہ راتوں کی نیندیں حاصل ہیں
 ساری دنیاؤں کی مسافت
 کہتے کہتے

پنے گھٹوں اور گھٹوں کے چرواہوں کی
 پابیت کا دم بھرتے بھرتے
 شہد کی نہریں زہر کے ساگر

تیکتے-تیکتے

کبھی کبھی تھک جاتا ہوگا

تیرے گیسٹو

کا کبکشاں کی دُھول سے اُٹ جاتے ہونگے

اور تیرے شانے

سارے زمانے کے انبار سے

ڈکتے ہوں گے

تیرے پاؤں

ازل سے لے کر ابد تک

پھیلے ہوئے صحراؤں کے سفر سے

چالوں سے پٹ جلتے ہوں گے

اور تیرے پیوند گے

جنوں کے نیچے

شاید جگہ جگہ سے

نسل پکے ہوں

مانک

ٹو اک روز اگر

سارے زمانے سارے ٹھکانے سارے فنانے

بھول کے میرے پاس آئے تو

میں تیرے ریشم جیسے

لٹنبے بالوں کو

بستی کے واحد چشمے کے

چاندی جیسے پانی سے دھوؤں

تیرے تھکے ہوئے شانوں کو

آہستہ آہستہ دابوں اور سہلاؤں

تیرے چھلنی چھلنی پاؤں کے تلوؤں سے

ساری تھکن کے کلنٹے چٹاؤں

تیرے دریدہ پیراہن کے

اَل اک چاک کوٹائیوں

اور جب تجھ کو پیاس لگے

یا بھوک لگے تو

سچے لغظوں کی سب سے اچھی بھیڑوں کا

خالص تازہ دودھ پلاؤں

اور پھر تجھ کو

اپنی نئے کی روتی ہوئی آنکھوں کے
بسکتے گیت سناؤں
تا کہ تو صدیوں کا جاگا تھا ہوا
اس کھلی فصل کے میدانوں میں
کچھ لمحوں کو سو جائے — آرام کرے
مالک

تو میری باتوں پر
کتنی محبت سے ہنستا ہے
لیکن میرے عصر کے موسیٰ
بمسم ہیں



مکین خوش تھے کہ جب بند تھے مکانوں میں
کھلے کواڑ تو تالے پڑے زبانوں میں

درخت ماڈل کی مانند انتطار میں ہیں
طیور لوٹ کے آنے نہ اشیانوں میں

ہوا کی زد پہ بھی دو اک چراغ روشن ہیں
بلا کے حوصلے دیکھے ہیں سخت جانوں میں

مجھے ہلاک کیا اعتماد نے میرے
کہ میکنتہ تھے سبھی میرے میزبانوں میں

کل آنے نے بڑے دکھ کی بات مجھے کہی
سرازا تو بھی ہے گزے گئے زمانوں میں



عشق کا شہر بھی دیکھو کیا نیسہ رنگ بھرا ہے
اب دیوانے کا دامن بھی سنگ بھرا ہے

اب یہ کھلائے کتنی پرانی دشمنیاں تھیں
یاروں میں ہر ایک کا خیمہ رنگ بھرا ہے

میرے بدل جانے پر تم کو حیرت کیوں ہے
نہیں نے یہ بہڑوپ تمہارے رنگ بھرا ہے

قتل گہوں کا رستہ اور دوسے کیا پوچھیں
لہو کے چھینٹوں سے اک اک فرنگ بھرا ہے

برہتی آنکھوں کی چُپ بھی قاتل ہے لیکن
اُس کے سکوتِ چشم میں جو آہنگ بھرا ہے

کچھ تو فراز اپنے قہقہے بھی ایسے ہی تھے
اور کچھ کہنے والوں نے بھی زنگ بھرا ہے



اب کے ہم پر کیا سال پڑا لوگو
شہر میں آوازوں کا کال پڑا لوگو

ہر چہرہ دو ٹنکڑوں میں تقسیم ہوا
اب کے دلوں میں ایسا بال پڑا لوگو

جب بھی دیارِ خندہ دلاں سے گزرتے ہیں
اس سے آگے شہرِ مظلوم پڑا لوگو

آٹے رُت اور جلے رُت کی بات نہیں
اب تو حسروں کا جنجال پڑا لوگو

تین نوائی کا منجمد تما صرف فراز
پھر کیوں سادے بلع پہ جال پڑا لوگو



جانے کس زعم میں مقتل کو بجائے تم ہو
 مجھ کو کیا قتل کرو گے مرے ملے تم ہو

میرا پندار بڑھتا ہے اسی معیار کے ساتھ
 جس رعوت سے مجھے دار پہ لائے تم ہو

اس نجات کے قہر سے عیاں ہیں یارو
 آستینوں میں وہ خنجر کہ چھپائے تم ہو

دوست کا لطف تو احسان ہے جب ہو جائے
 مہرباں پھر بھی بڑی دیر میں سکے تم ہو

بے آواز گلی کو چوں میں

دست بستہ و کمر بستہ و لب بستہ سہی
اس پہ بھی خوشش ہو کہ دربار میں آئے تم ہو

ہئے وہ صبحِ تماشا کہ نہ دیکھو گے فسراز
ہئے اُن شمعوں کی قسمت کہ جلائے تم ہو



ایک بوند سی لہو کی سرِ دار تو گری
یہ بھی نہایت سنے خوف کی دیوار تو گری

کچھ بچپن کی خُراتِ رندانہ کے بشار
اب کے خطیبِ شہر کی دستار تو گری

کچھ سر بھی کٹ گرے ہیں پہ کنہرام تو مچا
یوں قاتلوں کے ہاتھ سے تلوار تو گری

بے آواز گلی کوچوں میں

ایک بد نما صبح
کے بارے میں — کچھ نظمیں

جم گیا ہے آنکھوں میں ایک بد نما منظر
اب تو سب کے سب چہرے قاتلوں سے لگتے ہیں

دل کا قصہ یا افسانہ دار کا ہے
ہر محفل میں ذکر اُسی دلدار کا ہے



سارا شہر بکھٹے
پھر بھی کیا سکتے

ہر کوئی تصویر نس
دُور خلا میں تکتا ہے

گلیوں میں بازوؤں کی بو
یا پھر غم مہکتا ہے

سب کے بازو بچ بستے
سب کا جسم دکھتا ہے

بے آواز گلی کوچوں میں

ایک سفر وہ ہے جس میں
پاؤں نہیں دل تھکتا ہے

تیرا بچھڑنا جانِ غزل
شہرِ غزل کا مقطع ہے

حبلاؤ

تُو نے کب یہ سوچا ہے معصوم ہے کون اور قاتل کون
تُو نے کب یہ دیکھا ہے کوئی چہرہ کیسا لگتا ہے
ایسے بھی ہوتے ہونگے جن سے سُلی بھی سُڑتی ہو
ایسے بھی جن سے دُار کا تختہ سجا سجا سا لگتا ہے

جھوٹ کا عمامہ ہے کوئی یا چہرہ ہے چھائی کا
تو کیا جانے کس کے مُنارہ سر پہ کند افگن ہے
وہ منظور کا حرفِ انا ہو یا عیسیٰ کی شمعِ زمیں
خجہ کو کیا پنخیرِ سرا کوئی مولا ہے یا بندہ ہے

درباروں سے ہو کر جب انصاف کا قاصد آتا ہے
 سب کو خیر و بے گنہی کا اکثر جو انجمن ہوا
 میزانیں کن باتوں میں تھیں جنبشِ ابرو کس کی تھی
 کس پر اہل عدالت گر جے کس پر لطفِ اکرام ہوا

مخلِ مقتلِ مقتلِ سب پہل جلا دئے کون
 کوئی سمجھ کر بھی نہیں سمجھے کوئی اشارہ جانے ہے
 نام ہے کس کا دام ہے کس کا اور یہاں صیاد ہے کون
 جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جلنے ہے

چلو اُس شہر کا ماتم کریں

چلو اُس شہر کا ماتم کریں
جس کے سبھی موسم ہمیں پیارے تھے
وہ رات چاک دامانی کی تھی
یا خون رونے کی
ہوائے مہرباں کی راہ تیکنے کا زمانہ تھا
کہ فصل لالہ لعلیں کی حسرت میں
بدن انگار ہونے کی
سبھی موسم ہمیں پیارے رہے اس شہر کے
جو بد مقتدر تھا
کہ جس کی ساری دیواریں فصیلیں تھیں
کوئی روزن نہ رکھتی تھیں
وہ جس کی دودکش پہنائیاں
آنکھیں جلاتی تھیں
مگر روشن نہ رکھتی تھیں

ڈری سہمی ہوئی خلقت کی لاشیں
اس لئے گلیوں میں پھرتی تھیں
کہ وہ مدفن نہ رکھتی تھیں
مگر پھر بھی ہمیں اس شہر سے
کتنی محبت تھی

محبت تھی
کہ یہ شہر سحرِ نا آشنا
جس کا مقدر رات تھی یا صبح کا ذب تھی
گلی کوچوں میں
بازاروں میں

دھلیزوں پہ بیٹھے منتظر لوگو
تھیں بھی صبح صادق کا تصور
خواب پیارا تھا

ہمیں بھی تھا
چلو تاروں کا قتل عام بھی ہم کو گوارا تھا
ہمیں بھی اور تمہیں بھی
جن سیسہ راتوں نے مارا تھا

یہی سنتے رہے ہم تم
 انہیں کے دامنوں میں صبح صادق کا ستارا تھا
 مگر اس مترتبہ
 جس جھٹپٹے کو
 روشنی کا اذلیں زینہ سمجھ بیٹھے
 اُسی کی آخری منزل پر
 اب سوچ کی سیل لاش رکھی ہے
 (کسی آسیب نے شب خون مارا تھا)
 مگر اب سب کے چہرے اس قدر فق
 اور بازو اس قدر رشل ہیں
 کہ جیسے کورچسماں گورکن
 مصلوب سوچ کی بجائے
 شہر کو دفن کے آئے ہیں
 چلو اُس شہر کا ماتم کریں
 جس کے سمجھی موسم ہمیں پیارے رہے
 اور ہم جسے خود اپنے ہاتھوں سے
 کفن پہنا کے آئے ہیں
 جسے دفن کے آئے ہیں۔

حرف کی شہادت

آؤ جس میسے کو ہم نے سولی پر لٹکایا ہے
اُس کے لہو لہان بدن پر بین کریں
اور اشک بہائیں
فرض میں پورے اتر چکے
اب سترِ غم چکائیں

اس کی کھڑاؤں وہ لے جائے
جس نے صلیب بنائی تھی
چادر کا حصار ڈھیلے
جس نے کیل لگائی تھی
اور کانٹوں کا تاج ہے اُس کا
جس کی آنکھ بھرا آئی تھی

آؤ

اب ہم سب عیسیٰ ہیں
لوگوں کو بست لائیں
مردوں کو زندہ کرنے کا
مُبْعُزہ بھی دکھلائیں
لیکن اُس کا حرف تھا سب کچھ
حرف کہاں سے لائیں؟



جب یار نے رختِ سحر باندھا کب ضبط کا یارا اُس دن تھا
ہر درد سنے دل کو سہلایا کیا حال ہمارا اُس دن تھا

جب خواب ہوئیں اُسکی آنکھیں جب دُھند ہوا اُس کا چہرہ
ہر اشک ستارہ اُس شب تھا ہر جسم انگارہ اُس دن تھا

سب یادوں کے ہونے سوتے ہم کس سے گلے مل کر روتے
کب گلیاں اپنی گلیاں تھیں کب شہر ہمارا اُس دن تھا

جب تجھ سے ذرا غافل ٹھہرے ہر یاد نے دل پر دنگ دی
جب لب پہ تمہارا نام نہ تھا ہر دکھ نے پکارا اُس دن تھا

اک تم ہی فراز نہ تھے تنہا اب کے تو بلاوا جب آیا
اک بھیر لگی تھی مقتل میں ہر درد کا مارا اُس دن تھا



لباسِ دار نے منصبِ نیا دیا ہے اُسے
وہ آدمی تھا سیجا بنا دیا ہے اُسے

مگر سکونتِ فلک بھی زمین جیسا تھا
دُما ئے نیم شبی نے بھی کیا دیا ہے اُسے

سفرِ طویل نہ درپیش ہو مُسافر کو
جو نصفِ شب سے بھی پہلے جگا دیا ہے اُسے

وہ سب مَرُوف کبے شکل تھے سلامت ہیں
جو لفظِ چہرہ منسا تھا مٹا دیا ہے اُسے

کچھ اپنے شہر کا قاتل بھی بے مروت تھا
کچھ اپنے بھرنے بھی حوصلہ دیا ہے اُسے

فناں کہ اہل ہوس کی رقابتوں نے فراز
جو شخص جان جہاں مست گنوا دیا ہے اُسے



دست جگے ہوں کہ بھر پور فیندیں مسلسل اُسے دیکھنا
وہ جو آنکھوں میں تھے اور آنکھوں سے اوجھل اُسے دیکھنا

اس کڑی دھوپ میں دل تپکتے ہیں اور بام پر وہ نہیں
کل نئے موسموں میں جب آئیں گے بادل اُسے دیکھنا

وہ جو خوشبو بھی ہے اور جگنو بھی ہے اور آئینو بھی ہے
جب ہوا گنگنائے گی ناپے گا جنگل اُسے دیکھنا

جو ہواؤں میں ہے اور فضاؤں میں اور زماؤں میں ہے
کوئی پھیلائے دامن کہ لہرائے اسپنجل اُسے دیکھنا

ہے آواز گلی کوچوں میں

شاعری میں بھی اس جانِ جاں کا سراپا سماتا نہیں
اور آنکھوں کی دیرینہ خواہش مکمل اُسے دیکھنا

یہ بھی کیا سوچنا ہے کہ ہر وقت ناداں اُسے سوچنا
یہ بھی کیا دیکھنا ہے کہ ہر سمت پاگل اُسے دیکھنا

شامِ وعدہ سہی دکھ زیادہ سہی پھر بھی دیکھو قنبرا
آج شب اُسکی فرقت میں کہہ لو غزل کل اُسے دیکھنا



جو کچھ کہیں تو دریدہ دہن کہا جائے
یہ شہر کیا ہے یہاں کیا سخن کہا جائے

بصد ہے قیشہ خونیں لئے ہوئے کوئی شخص
کہ گور کن کو بھی اب کو حکن کہا جائے

اگر جوڑم صداؤں کے دیکھنا چاہو
تو شرط یہ ہے کہ پہلا سخن کہا جائے

پراخ بجھتے ہی رہتے ہیں پر جو اب کے ہوا
اے ہواؤں کا دیوانہ پن کہا جائے

محیب رسم ہے جو صدر انجمن ہو فراز
وہ چاہتے اے انجمن کہا جائے



گرفتہ دل عذیب گمانی گلاب دیکھے
محبتروں نے بھی رُتوں میں عذاب دیکھے

وہ دن بھی تھے صلیب گر بھی صلیب پر ہوں
یہ شہر اک روز پھر سے یوم حساب دیکھے

یہ صبح کاذب تو رات سے بھی طویل تر ہے
کہ جیسے صدیاں گزر گئیں آفتاب دیکھے

وہ چشم محروم کتنی محروم سے کہ جس نے
نہ خواب دیکھے نہ رنگوں کے عذاب دیکھے

بے آواز گلی کوچوں میں

کہاں کی اسکھیں کہ اب تو چہروں پہ آبلے ہیں
اور آبلوں سے محبت کوئی کیسے خواب دیکھے

محبت نہیں ہے جو خوشبوؤں سے ہے شہر خالی
کہ میں نے دھیلے زقالاتاں پر گلاب دیکھے

یہ ساعت دید اور وحشت بڑھا گئی ہے
کہ جیسے کوئی جنوں زدہ ماحبت اب دیکھے

بُٹے تو ہم کھتی کے دن یاد آگئے ہیں
کہ میں اُسے پڑھ رہا ہوں اور وہ کتاب دیکھے

دشمن کا قصیدہ

ہم کہ تلوار کے دشمن تھے
کہ تلوار مدد دیتی اپنی
اب مدد خواں ہیں
کہ تلوار کا کردار بھی تھا
اور حریف اپنا
کوئی یار جگر دار بھی تھا
اور وہ یار جگر دار طرہ دار بھی تھا

نہ کہ بارود کی نالی
نہ کہ فولاد کا خول
نہ کہ بزدل کا موقف
نہ کہ کم ظرف کا بول
کہ ہمیشہ رہی تلوار
سی حرف صفا کی مانند
سیج کے پرچم کی طرح
دل کی صدا کی مانند
کہ ٹٹا کی قبا اور ریا کی مانند
بے منتہی کی دعا کی مانند



افاکے بھیس میں کوئی رقیب شہر بھی ہے
مذکر کو شہر کا ستارہ قلیب شہر بھی ہے

ذہی سپاہ بستر خیمہ زن ہے پادشاہ طوف
جو یہ رسد بنت میں تھا بانیہ شہر بھی ہے

آواز کی گونج میں ہر پہلو سے کہیں
سہ جہت سے ہے جہل قریب شہر بھی ہے

بہ نرس کے حجر میں دوستے ہیں سکے گناہ بھی
تیرے ہجر کے وطن لم جیب شہر بھی ہے

بے آواز گلی کوچوں میں

یہ رازِ نعرہ منظرِ ہی سے ہم چھوٹ
کہ چوبِ منبرِ مسجدِ صلیبِ شہر بھی ہے

کڑی ہے جنگ کہ اب کے مقابلے پہ آزاد
امیرِ شہر بھی ہے اور خطیبِ شہر بھی ہے

ہواؤں کی بشارت

تیرے ہواؤں کے ہوش پتھر ہیں

اور آنکھوں میں زخم ہیں

اور دل تپکتے ہیں

رات کہتی ہے

”ان کے بیٹوں کو

شب گئے

چند لشکری

ساتھ لے گئے تھے

”تو اب تک انکی واپسی کی خبر نہیں ہے“

سبے آواز گلی کوچوں میں

نہ واپسی کا گمان رکھنا
ہوا میں سہمے ہوئے چراغوں سے کہہ گئی تھیں
کہ آنے والی راتوں کے آغاز تک
ٹھامے نصیب میں روشنی کا کوئی سفر نہیں ہے
یہ مائیں پتھر بنی رہیں گی
اور اُنکے آتشوجھے رہیں گے
اور اُنکی آہیں تھمی رہیں گی
نہ جی سکیں گی
نہ مر سکیں گی

مست قتل کرو آوازوں کو

تم اپنے عقیدوں کے نیزے
ہر دل میں اتارے جاتے ہو
ہم لوگ محنت والے ہیں
تم خنجر کیوں لہراتے ہو

اس شہر میں نمٹنے سے پہلے دو
بستی میں ہمیں بھی رہنے دو

مسم پالٹہا ہاں ہاں پھولوں کے
ہم خوشبو کے رکھوالے ہاں
تم کس کا لہو پیٹنے آئے
ہم پیار سکھانے والے ہاں

اس شہر میں پھر کیسا دیکھو گے
جب حرفت یہاں مر جائے گا
جب تیغ پائے کٹ جائے گی
جب شعر سنہ کر جائے گا

جب قتل ہوا سر سازوں کا
جب کال پڑا آوازوں کا

جب شہر کھنڈ بن جائے گا
پھر کس پر غم اٹھاؤ گے
اپنے چہرے آئینوں میں
جب دیکھو گے اڑ جاؤ گے



عجب شہرت تھی اور عجب لوگ تھے
بستم صورتیں تھیں غضب لوگ تھے

فقیر اس گلی کے گداڑ بے
سراپا طلب بے طلب لوگ تھے

وہ کافر اکیلا بکھنپا دار پر
نساڑ جنازہ میں سب لوگ تھے

انہیں راستوں پر کلاہیں گریں
انہیں رگزاروں میں جب لوگ تھے

ہے آواز نکلی کوچوں میں

نہ مقتل نہ میلا تماشا کوئی
مگر جا بجا ہے سبب لوگ تھے

سبھی سر پہ مجدہ تھے دربار میں
ہم ایسے کہاں ہے ادب لوگ تھے

فسادِ اپنی بربادیوں کا سبب
نہ اب لوگ ہیں اور نہ جب لوگ تھے



یہ کبر، عذاب سے خائف مراقبہ سہل ہے
کہ خونِ مل کے بھی چہروں کا رنگ پیلا ہے

یہ کیسی زہر بھری بارشیں ہونیں اب کے
کہ میرے سارے کلابوں کا رنگ نیلا ہے

ہو کبیں طین سے محبت کی گفتگو کہ ابھی
برے لہو سے ترا فرش و سقف کیدا ہے

گدا گراں سخن کو زید ہو کہ یہاں
نیک سری ہی نقطہ رزق کا وسیع ہے

فراز اسی لئے مسم زندگی پر مرتے ہیں
کہ یہ بھی زندگی کرنے کا ایک جیل ہے



جنہیں زخمِ کمانداری بُہت ہے
انہیں پر خوف بھی طاری بُہت ہے

کچھ آنکھیں بھی ہیں سینائی سے ماری
کچھ آنسو بھی زنگاری بُہت ہے

نہ جانے کب لٹے گا شہرِ مقتل
نہاں ہے اب کے تیاری بُہت ہے

کچھ اب کے ٹوٹا چاہتا خود بھی
کچھ اب کے مار بھی کاری بُہت ہے

یہاں پیہم قبیلے قتل ہونگے
یہاں شوقِ سزاواری بُہت ہے

شہر آشوب

اپنی بود و باش نہ پوچھو
ہم سب بے توقیر ہوئے
کون گریباں چاک نہیں ہے
ہم ہوئے تم ہوئے ہمیر ہوئے

سہمی سہمی دیواروں میں
سایوں جیسے رہتے ہیں
اس گھر میں آسیب بسا ہے
مائل کامل کہتے ہیں

دیکھنے والوں نے دیکھا ہے
اک شب جب شبِ خون پڑا
گھٹیوں میں بارود کی بُرستی
کھیلوں پر سب خون پڑا

اب کے خیر نہیں تھا کوئی
گھر واسے دشمن سے نکلے
جن کو برسوں دودھ پلایا
ان ناگوں کے پھن نکلے

رکھوالوں کی نیت بدلی
گھر کے مالک بن بیٹھے
جو غاصب تھے محن کش تھے
صوفی سالک بن بیٹھے

جو آواز جہاں سے اُٹھی
اس پر تیسرے تیرے بوسے
ایسے ہر منٹ سے لوگوں کے
سرگوشی کو بھی ترسے

گلی گلی میں بندی خاسنے
چوک چوک میں متعلقات ہیں
جناہوں سے بھی بڑھ چڑھ کر
محسن و حشر پاگل ہیں

کہتے بے نینوں کے گئے یہ
روز کسندیں پڑتی ہیں
بڑھے پتے گھر سے غائب
بیاباں جیل میں سڑتی ہیں

اس کے ناخن کھینچ لیئے ہیں
اس کے بدن کو داغ دیا
کچھ قبریں در در لاشیں
بجھا ہر ایک چسراغ دیا

ماؤں کے ہنٹوں پر ہیں نرسے
اور بہنیں کڑلاتی ہیں
رات کی تاریکی میں ہونٹیں
کیسے سنبھلے لاتی ہیں

قاتل اور درباری اس کے
اپنی ہسٹ پر قائم ہیں
ہم سب چور ٹھیسے ڈاکو
جو سب کے سب بھڑے ہیں

ہے آواز گل کوچوں میں

ہمیں میں کرنی صبح سویرے
کھیت میں مُردہ پایا گیا
ہمیں سادہ بشت کرو تھا کر
پھپ کے جیتہ و فاپ

سارا شہر سب کے مُردہ خانہ
کون اڑ جیتے سب رہا ہے
ہم مارے لاد رشتہ دیش
کون ہمیں پوچھنے

محاصرہ

مرے غنیم نے مجھ کو پیام بھیجا ہے
کہ حلقہ زن ہیں مرے گرد لشکری اُس کے
فصیل شہر کے ہر بزرگ ہر مسلے پر
کماں بدست ستادہ ہیں عسکری اُس کے

وہ برق لہر بجا دی گئی سرے جس کی تپش
وہ خود خاک میں آتش فشاں جگاتی تھی
بچھا دیا گیا بارود اُس کے پانی میں
وہ جوئے آب جو میری مگلی کو آتی تھی

سبھی دریدہ دہن اب بدن دریدہ ہوئے
پُردِ دار و درسن سارے سرکشیدہ ہوئے

تمام صوفی و سالک سبھی شیوخ و امام
امیدِ لطف پہ ایرانِ کجکلاء میں ہیں
معزینِ عدالتِ حُسن اُٹھانے کو
مثالِ سائلِ مہرمِ نیشستہ راہ میں ہیں

تُم اہلِ حرف کے پندار کے شناگر تھے
وہ آسمانِ بہتر کے بخومِ سامنے ہیں
بس اکِ مصاحبِ دربار کے اشارے پر
گداگرانِ سخن کے جھومِ سامنے ہیں

قلندرانِ وفا کی اساس تو دیکھو
تُھمارے پاس ہے کون آس پاس تو دیکھو

سو شرط یہ ہے جو جاں کی امان چاہتے ہو
 تو اپنے لوح و قلم متصل گاہ میں رکھ دو
 وگرنہ اب کے نشانہ کسانداروں کا
 بس ایک تم ہو سو غیرت کو راہ میں رکھ دو
 یہ شرط نامہ جو دیکھا تو اچھی سے کہا

اُسے خبر نہیں تاریخ کیسے سکھاتی ہے
 کہ رات جب کسی خورشید کو شہید کرے
 تو صبح اُن کی سیا سوج تراش لاتی ہے

سو یہ جواب ہے میرا مرے عذو کے لئے
 کہ بھج کو مرے کرم ہے نہ خوفِ خمیازہ
 اُسے ہے سطوتِ شمشیر پر گھمنڈ بہت
 اُسے شکوہِ قلم کا نہیں ہے اندازہ

مرا تسلّم نہیں کردار اُس محفاظ کا
جو اپنے شہر کو محصور کر کے ناز کرے
مراقلم نہیں کا سہ کسی سبک سر کا
جو غاصبول کو قصیدوں سے سرفراز کرے

مرا تسلّم نہیں اوزار اُس نقب زن کا
جو اپنے گھر کی ہی پخت میں شکاف ڈالتا ہے
مراقلم نہیں اس دزدِ نیم شب کا رفیق
جو بے چراغ گھروں پر کمند اُچھالتا ہے

مراقلم نہیں تسبیح اُس مہستخ کی
جو بندگی کا بھی ہر دم حساب رکھتا ہے
مراقلم نہیں میسّران ایسے عادل کی
جو اپنے چہرے پہ دُہرا نقاب رکھتا ہے

مراقلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
مراقلم تو عدالت مرے ضمیر کی ہے
اسی لئے توجہ لکھتا تپاک جاں سے بلکھا
جیسی تو لوح کماں کا، زبان تیر کی ہے

میں کٹ گروں کہ سلامت ہوں یقین ہے مجھے
کہ یہ حصارِ ستم کوئی تو گرائے گا
تمام عسکر کی ایذا نصیبیوں کی قسم
مرے قلم کا سفر رائیگاں نہ جلے گا

سرشتِ عشق نے افستادگی نہیں پائی
تو قدِ سرو نہ بیسنی و سایہ پیمائی!

